وزیر آغا کی انشائیہ نگاری

ڈاکٹر رشید امجد *
محمد افضال بٹ **

Abstract:

Dr. Wazeer Agha is a poet, essayist and critic. He has produced more than 40 prose books.He introduced "Inshaia" in Urdu Literature. This article indicates the basic themes of his" Inshaia Nigari".

جہاں تک انشائی مزاج کی تحریروں کا تعلق ہے تو سرسید سے بہت پہلے اردو داستانوں میں اس کے ٹکڑے تلاش کیے جا سکتے ہیں، سرسیّد نے اُردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز کر کے جس طرح کی تحریریں لکھیں ان میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مزاحیہ اور انشائی عناصر بھی موجود تھے حتیٰ کہ مقالہ بھی مضمون ہی کہلاتا تھا لیکن بعد میں طنز و مزاح عام مضمون سے علیحدہ ہو گئے ۔ سنجیدہ اور استدلائی مضمون میں فرق قائم نہیں ہو سکا۔ وزیر آغا پہلے شخص ہیں جنھوں نے انشائیہ کو ایک علیحدہ پہچان دی۔ وہ کہتے ہیں:

> ''بادی النظر میں انشائیہ یا پرسنل ایسے کی حدود متعین کرنا ایک خاصا کٹھن کام ہے کیونکہ نہ صرف تاریخی اعتبار سے انشائیہ کے مفہوم اور ہیت میں کئی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں بلکہ ہر انشائیہ کیا بہ لحاظ مواد اور کیا بہ لحاظ تکنیک، ایک جداگانہ کیفیت کا حامل ہے۔ تاریخی اعتبار سے لیمب اور چسٹرٹن کے طریق کار میں اتنا تضاد ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مضامین کو ایک ہی زمرے میں شامل کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔''(۱)

وزیر آغا نے انشائیہ کے لیے جن باتوں کو ضروری قرار دیا ہے ان میں اول اس کا غیر رسمی طریقہ کار ہے، دوم، اس کی عدم تکمیل ہے تیسرا اس کا اختصار ہے۔ چوتھا اس کی تازگی ہے۔ اس میں ایک اور عنصر بھی شامل کرنا چاہیے وہ انشائیہ کا اسلوب ہے۔ بقول وزیر آغا جب انہوں نے ادب لطیف میں لائٹ ایسے لکھنے شروع کیے تو اس کے لیے 'لطیف پارہ' کی ترکیب استعمال کی، پھر کچھ عرصہ 'انشائے لطیف' بھی کہا گیا لیکن ادب لطیف کے مدیر مرزا

---

* صدر نشین شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
** شعبہ اُردو، الخیر یونیورسٹی، آزاد جموں و کشمیر

ادیب ان دونوں تراکیب سے مطمئن نہ ہوئے تو وزیرآغا کے لفظوں میں اسی دوران میں نے کسی ادبی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا۔ مرزا ادیب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس کے بعد ادب لطیف میں لائٹ ایسے کے لیے انشائیہ کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا اور خوش قسمتی سے یہ مقبول بھی ہوگیا۔ (۲)

میرے نزدیک انشائیہ کے لیے تازگی اور اسلوب کی شگفتگی دو ایسے عناصر ہیں جن کے بغیر انشائیہ اپنی پہچان نہیں بناتا۔ بنیادی طور پر یہ اظہارِ ذات کی ایک صورت ہے بلکہ انکشافِ ذات کا ایک ایسا عمل ہے جس میں روحانیت کا ذائقہ بھی ہے اور مادیت کی مٹھاس بھی۔ (۳) یہ اندر کی ایسی غواصی ہے جس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مسرت کو قاری تک پہنچانا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے انشائیہ نگار کی شخصیت بھی اہم ہے، اس میں جتنی نفاست، شائستگی اور فلسفیانہ عظمت ہوگی اتنی ہی اس کے انشائیہ میں ارفع مسرت پیدا ہوسکے گی۔ انشائیہ کو لمبی چوڑی علمی توجیہات اور تکنیکی باریک بینیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے لیے خیالات کا تسلسل اور ان کے پیچھے ایک فکری کڑی کی ضرورت ہے جو باتوں باتوں میں نئے امکانات کے ورق کھولتا چلا جاتا ہے۔ انشائیہ انسان اور انسان کے متعلقات کی بحث کرتا ہے اور اس میں زندگی کے کئی پہلو شگفتہ اور ہلکے پھلکے انداز میں منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ انشائیہ نگار کا اندازِ نظر ہے جو انشائیہ میں جدت اور ندرت پیدا کرتا ہے۔ ہر انسان کے اندر اس کا اپنا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں دوسروں سے مختلف موتی موجود ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اس غواصی کے نتیجے جو کچھ ہاتھ آتا ہے اسے کس انداز سے دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ انشائیہ میں یہ پیش کش ہی اس کی پہچان ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ خود وزیرآغا کا کہنا ہے:

> ''انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔''(۴)

انشائیہ قاری کو سوچ کے لیے نئے زاویے دکھاتا ہے اور اس کے اندر ایسے رویوں کو جنم دیتا ہے جن کے نتیجے میں وہ چیزوں کو معمول کی بجائے غیر معمولی انداز میں دیکھنے لگتا ہے۔ یہ غیر معمولی نتائج اسے مسرت بھی فراہم کرتے ہیں اور اس کی فکر کو بالیدگی بھی عطا کرتے ہیں۔ بقول وزیرآغا:

> ''میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ انشائیہ نگار ایک ایسے جزیرے کی طرح ہے جو چاروں طرف سے مواج سمندر میں گھرا ہوا ہو چونکہ بیسویں صدی افکار و محسوسات کے اعتبار سے ایک مواج صدی ہے لہٰذا اس میں جا بجا جزیرے سے نظر آنے لگے ہیں یعنی ایسے تخلیق کار جو افکار کی حدت اور جذبات کے کہرام کو محسوس تو کرتے ہیں مگر ان سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایسے تخلیق کار جو اس قابل ہیں کہ وقفے وقفے سے رک کر زندگی کے تلاطم پر ایک نظر ڈال سکیں۔ ویسے

> یہ وقفے وقفے سے رکنا (یعنی مواج سمندر میں جزیرہ بن جانا) ہی انشائیہ کا اہم ترین وصف بھی ہے۔ رکنے کے ان لمحات میں انشائیہ نگار نہ صرف اپنے بلکہ قاری کے ذہن کو بھی متحرک کرتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ''نئے نئے دروازے اور کھڑکیاں کھل رہی ہوں اور لاکھوں امکانات تاریکی میں سے اچک اچک کر دیکھنے لگے ہوں۔''(۵)

وزیرآغا نے انشائیہ کی تکنیک، مزاج اور دوسرے فنی مراحل کی تعریف کرنے اور اس کی ایک علیحدہ فنی حیثیت قائم کرنے کے لیے متعدد مضامین لکھے لیکن انہوں نے خود بھی انشائیے لکھے مطلب یہ کہ وہ انشائیہ کے نظری نقاد نہیں بلکہ انہوں نے انشائیہ کی جو تعریف کی اس کے مطابق انشائیے لکھ کر اسے عملاً ایک صنف کی حیثیت دی۔ ان کے انشائیوں کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ جن کی ترتیب یہ ہے۔

۱۔	خیال پارے	۱۹۶۱ء
۲۔	چوری سے یاری تک	۱۹۶۶ء
۳۔	دوسرا کنارہ	۱۹۸۲ء
۴۔	سمندر اگر میرے اندر گرے	۱۹۸۹ء

یہ چاروں مجموعے اور آخری مجموعے کے بعد لکھے جانے والے انشائیے 'پگ ڈنڈی' کے نام سے کلیات کی صورت میں شائع ہوئے۔ منور عثمانی کی رائے میں ''اُردو میں انشائیوں کی پہلی باقاعدہ کتاب 'خیال پارے' ہے۔''(۶)

'خیال پارے' کی اہمیت محض اس لیے نہیں کہ اس کتاب نے پہلی بار انشائیہ کا معیار مقرر کیا بلکہ ڈاکٹر انور سدید کے لفظوں میں:

> ''اس کتاب کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے انشائیہ کیا ہے، کے عنوان سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا اور اس فن کے لیے مناسب جواز بھی مہیا کیا۔''(۷)

خیال پارے کی اشاعت کے بعد اردو انشائیہ کا ایک نیا دور شروع ہو جس میں انشائیہ طنز و مزاح سے علیحدہ ہو کر ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے سامنے آیا۔

یہ بات اس لیے اہم ہے کہ خیال پارے سے پہلے اتنی بڑی تعداد اور نئے ذوق و شوق کے ساتھ کبھی انشائیہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس سے پہلے کی صورت یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے جو کچھ لکھا اس کے بارے میں وہ خود بھی واضح نہ تھے کہ یہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے کبھی انشائے لطیف، کبھی نثر لطیف اور کبھی انشائیہ کی اصطلاح استعمال کی۔ یہ اصطلاح چونکہ واضح فنی تصور نہ رکھتی تھی۔ اس لیے نہ تو تحریک کی ایک شکل اختیار کر سکی اور نہ رجحان بن پائی، خیال پارے نے فنی وضاحتوں کے ساتھ ساتھ فنی جواز بھی فراہم کیا، چنانچہ لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس طرف متوجہ ہوئی۔ ڈاکٹر انور سدید کی رائے میں:

''میری رائے میں انشائیہ کے فروغ اور نقاد میں ''خیال پارے'' کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ترقی پسند تحریک میں افسانوں کے مجموعے انگارے کو تفویض کی جاتی ہے۔ ''خیال پارے'' نے انشائیہ کو وسیع پیانے پر متعارف کرانے اور اس صنف کی فنی بوطیقا مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔''(۸)

انشائیہ بھی دوسری اصناف کی طرح یورپ ہی سے آیا ہے لیکن ان تمام اصناف کو مشرقی مزاج اپنانا پڑا۔ چنانچہ جن لوگوں نے مشرقی مزاج کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا وہ بنیادی لہر سے علیحدہ رہے۔ کچھ یہی صورت جدید افسانے کی بھی ہے جن افسانہ نگاروں نے مشرقی اندازِ فکر اور مزاج کا اندازہ نہیں کیا ان کے یہاں جدیدیت کے تمام رموز کے باوجود ایک اُکھڑا پن نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ انشائیہ کی بھی یہی صورت ہے کہ انشائیہ اگر اپنی زمین، ثقافتی مزاج اور زبان سے آشنا نہ ہو تو اس کا طرز اور طور یورپی ہوگا۔ وزیر آغا نے اردو انشائیہ کو اپنے ثقافتی مزاج اور مشرقی آہنگ سے آشنا کیا۔ ان سے پہلے جو انشائیہ ڈانواں ڈول پھر رہا تھا اسے ایک متعین راستہ پر ڈال دیا، یہی ان کی سب سے بڑی عطا ہے۔

انشائیہ انکشاف ذات ہے، بلکہ ذات کے حوالہ سے انکشاف کائنات کہ انشائیہ نگار اپنی ذات کو آئینہ بنا کر اس میں پوری کائنات کا عکس پیش کرتا ہے اس لحاظ سے انشائیہ کا عمل صوفیانہ عمل ہے جس کے نتیجہ میں خود انشائیہ نگار بھی اندرونی مسرت سے ہمکنار ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو بھی مادے کی سطح سے بلند کر کے ماورائے زماں ایک نئی خوشبو اور مسرت سے آشنا کرتا ہے ڈاکٹر جانسن کے لفظوں میں ایک انشائیہ فن کار کی انفرادیت اور شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار فرد کو جماعت اور جزو کو کل پر ترجیح دیتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی اس رائے میں انشائیہ لکھنے والے کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کا اظہار بھی ہے۔ شخصیت کے اظہار پر بار بار زور دینے سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ شاید انشائیہ شخصی اظہار تک ہی محدود ہے اور اس طرح اپنے عصر سے علیحدہ ہو جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ انشائیہ براہ راست اظہار کی بجائے چیز اور مشاہدے کی خوشبو کو پیش کرتا ہے لیکن دراصل انشائیہ اپنے عصر کی وہ خوشبو ہے جو پورے باغ کے دکھ سکھ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے چنانچہ انشائیہ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی کیفیات کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹھوس اظہار کی بجائے احساسات و کیفیات کو پیش کرتا ہے بقول انور سدید:

''انشائیہ میں عصری آگہی اپنے تصور کو جامد صورت میں پیش نہیں کرتی۔ بلکہ اس کا مدار بھی ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے۔ کبھی انشائیہ نگار اپنی ذات کے ایک نکتے کے انکشاف سے زمانے کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور کبھی زمانہ کائنات کے زینے سے ذات کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انشائیہ نگار کسی تیز یا ترش ردِعمل کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ زمانے کی خلوت میں داخل ہونے کے لیے ہمارے سامنے اپنی شخصیت کا دریچہ کھول دیتا ہے بالفاظ دیگر انشائیہ

معاشرے کے اعمال وافعال کی ہر حرکت کو دیکھتا ہے اور اس کی ہر لرزش کو مہکے ہوئے پھول کی طرح اپنے دامن میں سمٹ لیتا ہے۔اور یوں انشائیہ نگار کی لوحِ دل سے جو نقش بھی ابھرتا ہے اس میں زمانے کی روح موجود ہوتی ہے۔''(۹)

عصری آگہی کے اس تصور میں انشائیہ کا اسلوب بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ نفاست اسلوب کی اعلیٰ سطح کے بغیر ممکن نہیں۔ وزیر آغا انشا کی تازہ کاری اور زبان کے تخلیقی استعمال کے ساتھ ساتھ انشائیہ سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ شے یا مظہر کے چھپے ہوئے ایک نئے معنی کو سطح پر لائے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے لفظوں میں ''انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسنِ انشا ہے'' اور ڈاکٹر محمد حسنین کے لفظوں میں ''انشائیہ نثری ادب کا ایک خاص اسلوب ہے۔''(۱۰)

ڈاکٹر جے براؤن کا کہنا ہے کہ اگر خیال کی مثال سونے کی ہے تو اسلوب وہ مہر ہے جو اسے عصری سچائی دیتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ یہ کس ٹکسال سے جاری کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جے براؤن نے اسلوب کو اپنے عہد کی پہچان قرار دیا ہے میری رائے میں اسلوب خیال کی زمانی اور عصری حیثیت کا تعین کرتا ہے انور سدید کے رائے میں:

''اسلوب ہیت اور خیال کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر اور باطن ہیں لفظ ان دونوں کے اشتراک باہم کا وسیلہ ہے۔''(۱۱)

اُردو انشائیہ کے بارے میں ابتدائی اعتراضات یہ تھے کہ اس کا زندگی کے تحرک اور مسائل سے کوئی تعلق نہیں یہ محض ایک ذہنی عیاشی ہے جسے مسرت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بات کلی طور پر درست نہیں۔ وزیر آغا کے انشائیے مسائل کی بات کرتے ہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ انشائیہ دوسری وضاحت کی طرح مسائل ومتعلقات پر براہ راست بات نہیں کرتا۔ یہ سارا عمل غیر رسمی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس غیر رسمی عمل کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

''غیر رسمی طریقہ کار سے مراد صرف یہ ہے کہ انشائیہ نگار آپ کے سامنے بھاری بھرکم دلیلوں اور بوجھل مسائل کے انبار سے گریز کرتا ہے۔''(۱۲)

انشائیہ نگاری ایک بلند تخلیقی صلاحیت کی متقاضی ہے بلکہ صوفیانہ مزاج اور کشف کی ایک خاص کیفیت سے آشنائی چاہتی ہے۔فنی طور پر کئی اصناف اس میں مدغم ہوتی دکھائی دیتی ہیں کہ اس میں کہانی کا سا مزا مضمون جیسی وسعت اور مطالعہ، نظم جیسا تسلسل اور غزل جیسا ایجاز واختصار موجود ہے۔ یوں انشائیہ لکھنے کا عمل ایک بڑا تخلیقی عمل ہے۔جس میں انکشافِ ذات بھی ہے اور انکشافِ عہد بھی۔ ڈاکٹر سدید نے انشائیہ کے فن ہیت اسلوب اور موضوع کی بحث کو سمیٹتے ہوئے بڑا اہم نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:

''انشائیہ نگار زمانے کے مواج سمندر میں گہرا غوطہ لگانے کے لیے ہر وقت بے تاب رہتا ہے اور جب زمانہ اس پر اپنے اسرار چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی صورت میں کھولنے لگتا ہے تو

انشائیہ نگار انہیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ انہیں انشائیہ کی تخلیقی صورت دے کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا ہے چنانچہ میری نظر میں انشائیہ لکھنا محض اظہار ذات ہی نہیں بلکہ یہ ایک کریمانہ عمل بھی ہے۔"(۱۳)

وزیر آغا کے انشائیوں نے نہ صرف اردو میں انشائیہ کو اظہار کے موثر ذریعہ کے طور پر پہلی بار متعارف کرایا، بلکہ اس فن کی شکل وصورت کو نکھار کر انشائیہ کا ایسا چہرہ بھی بنایا جو دوسری اصناف میں اپنی الگ پہچان اور مزاج رکھتا ہے۔ انشائیہ اب ایک رجحان نہیں، تحریک بن چکا ہے۔ ایک ایسی تحریک جو بتدریج مستقبل کے اظہار بنتی چلی جارہی ہے کہ انشائیہ اظہار ذات بھی ہے اور انکشافات کائنات بھی۔ مستقبل کے انسان کے یہی دو بنیادی مسئلے ہیں کہ جوں جوں اس کے خارج کا علم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسانی سائیکی کی تاریخ بھی پھیلتی چلی جاتی ہے اور اپنے آپ کو جاننے پہچاننے اور اپنے آپ سے مکالمہ کرنے کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ دوسری طرف کائنات اپنے تمام اسرار کے ساتھ بازو وا کیے سامنے کھڑی ہے اور جدید انسان کبھی اپنے حوالہ سے کائنات کو اور کبھی کائنات کے حوالہ سے اپنے آپ کو سمجھنے کی جستجو کر رہا ہے۔ یہ دوسرا سفر پیچیدہ بھی ہے اور قدم قدم پر نئے نئے انکشافات اور اسرار سے بھی بھرا ہے۔ اس پیچیدگی، کشف اور اسرار کا بہترین اظہار انشائیہ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

وزیر آغا نہ صرف یہ کہ نقاد کے طور پر انشائیہ کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور انہوں نے اپنے کئی مضامین انشائیہ کے چہرے اور ہیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ اسے تخلیقی سطح پر بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے، چنانچہ ان کے انشائیے جہاں ایک طرف انشائیہ کا ایک معیار مقرر کرتے ہیں۔ وہاں دوسرے انشائیہ نگاروں کے لیے اس صنف کی پہچان کا وسیلہ بھی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو ایک متحرک اور فعال صنف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انشائیہ نہ صرف زندگی کے اسرار و رموز کا غماز ہے بلکہ وہ اس متحرک کا اشارہ بھی ہے جو زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ ہمارے بعض جذباتی دوست انشائیہ کو پڑھے بغیر ہی اس صنف کو بورژوا ذریعۂ اظہار کے حوالے سے بھی ایک زندہ فعال صنف ہے جس میں شہری اور دیہاتی دونوں رخوں کا خوبصورت اظہار ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انشائیہ خارجی سطح پر جھنجھوڑنے کی بجائے داخلی پرت میں جا کر ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ وہ بدنی لذتوں کی بجائے روحانی کیف سے سرشار کرتا ہے۔ خود وزیر آغا کے لفظوں میں۔

"انشائیہ کا مقصد سلانا نہیں بلکہ جگانا ہے۔ جذبے میں بہہ جانا نہیں بلکہ سوچ کو متحرک کرنا ہے۔ مگر سوچ کا یہ تحرک، جذبے اور احساس کی حدت سے آشنا ضرور ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انشائیہ ادب کے زمرے ہی سے خارج ہو جائے اور کاروباری، فلسفیانہ یا سائنسی انداز نظر کا مظاہرہ کرنے لگے۔"(۱۴)

انشائیہ اشیاء کے بطون میں چھپے ہوئے اس مخفی اور پراسرار مفہوم کو سامنے لانے کا نام ہے جو ظاہری آنکھ سے اوجھل ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ اسی مقام پر پہنچ کر لکھا جا سکتا ہے جب شخصیت میں نفاست اس درجے پر پہنچ جائے کہ اس کی ظاہر داری ختم ہو جائے اور وہ اندرونی ذات کا حصہ بن جائے، دوسرے لفظوں میں انشائیہ ظاہر داری کی فضا سے بلند ہو کر اس دنیا میں داخل ہونے کا نام ہے۔ جہاں کی ساری اشیاء ایک دوسرے کے لیے نہ صرف اپنے مفاہیم رکھتی ہیں بلکہ خلوص اور سچائی کی ایک نہ ختم ہونے والی فضا بھی۔ یہ ازل کا لمحہ ہے جہاں ساری کائنات کھلی آنکھوں کے سامنے نئے سرے سے بنتی، پھیلتی دکھائی دیتی ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر وزیر آغا کے لفظوں میں، شے یا مظہر کے اندر چھپے ہوئے نئے معنی سطح پر آ جاتے ہیں۔ یہ وہ معنی ہیں جو ظاہری آنکھ سے مستور تھے۔اور جب یہ معنی دریافت ہوتے ہیں تو ایک ایسی مسکراہٹ جنم لیتی ہے جو گیان کے پہلے لمحے میں بدھ کے ہونٹوں پر کھلی تھی۔ یہ مسکراہٹ، یہ خوشی، یہ شانتی ہی انشائیہ نگار کا سارا اثاثہ ہے۔اور اسی اثاثے کا لفظی روپ انشائیہ ہے۔ گویا انشائیہ اپنی اندرونی بنت کاری میں ایک کشفی صنف ہے جس کے لیے بنیادی طور پر ایک صوفی کا ویژن ہونا ضروری ہے۔لیکن اس کا اظہار صوفی کا اظہار نہیں بلکہ ایک فن کار کا اظہار ہے۔صوفی گیان کی منزل پر پہنچ کر، جلوے کی تابانی سے ہمکنار ہو کر، لذت وسرور سے بھر جاتا ہے لیکن جب اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ یہ مسرت کیا ہے، یہ دید کیا ہے تو تصوف کی ادق اصطلاحوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔انشائیہ نگار بھی اسی منزل سے گزرتا ہے، لیکن حقیقت کو جاننے کی مسرت کو سمیٹ کر اسے لفظوں میں ڈھالنے کی قدرت رکھتا ہے۔

وزیر آغا کے مجموعوں کے حوالہ سے اگر اردو انشائیہ اور خود آغا صاحب کے فن انشائیہ نگاری پر نظر ڈالی جائے تو نہ صرف اردو انشائیہ کی قدم قدم تاریخ سامنے آتی ہے بلکہ آغا صاحب کے فنی سفر کے کئی پہلو بھی اپنی ارتقائی صورت میں واضح ہوتے ہیں 'خیال پارے' میں آغا صاحب کا رویہ اشیاء کے ساتھ حیرت اور مسرت کا ہے یعنی اشیاء، مسرت کے ساتھ ساتھ اپنی چکاچوند سے انہیں رنگ برنگے جذبوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔انہیں دیکھ کر ان کے قریب جانے کی زبردست خواہش جنم لیتی ہے، یہ گویا مطالعہ فطرت کا وہ زمانہ ہے جب اشیاء اپنے خارجی وجود کے ساتھ اپنی پہچان کراتی ہیں۔ یہ چیزوں سے لپٹ جانے اور انہیں محسوساتی سطح پر دیکھنے کا زمانہ ہے۔

'چوری سے یاری تک' ایک پڑاؤ ہے جہاں لمحہ بھر کے لیے ٹھہر کر سفر کی ساری عطا کو سمیٹنے کی تصویر ابھرتی ہے اس ساری عطا کو دیکھ کر سنجیدگی اور بردباری کی کیفیات ابھرنے لگتی ہیں۔ چنانچہ خیال پارے کی سیمابی کیفیت کے برعکس 'چوری سے یار تک' میں ایک ٹھہراؤ محسوس ہوتا ہے۔'دوسرا کنارہ' اس ٹھہراؤ کا اگلا قدم یعنی فلسفیانہ بلندی اور گیان کی مسرت کا اظہار ہے۔اب اشیاء اپنی ساری اندرونی اور خارجی صورتوں کے ساتھ اپنی پہچان کرا رہی ہیں

اور وہ مقام آن پہنچا ہے جہاں ہر شئے کو باطن کے حوالے سے دیکھنے اور سمجھنے کی قوت جنم لے چکی ہے گویا اب اشیاء نہ تو صرف حیرت ہیں نہ صرف عظمت بلکہ انہیں دیکھ کر، ان کی اصل جان کر، ایک روحانی مسکراہٹ جنم لیتی ہے کہ اشیاء کی حقیقت جان لی گئی ہے۔

'دوسرا کنارہ' وزیرآغا کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں ان کی فکری وفلسفیانہ بالیدگی کا اظہار ایک نئی سطح پر ہوا ہے۔منور عثمان کی رائے میں:

> ''اس میں انشائیہ نگار کی فکر، عمر اور جمالیات کی تیسری سطح ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ تیسری سطح بھی ایک رخی نہیں اس کے تین جلی رخ ہیں۔ پہلا نمایاں رخ یہ ہے کہ فکر، احساس اور رویے میں آزادی و بے نیازی دور قید ہوگئی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ انفرادیت کو بیرونی خطرے سے بچایا گیا ہے اور اجتماعیت سے کئی جہتوں میں ربط مکالمہ بڑھا ہے۔ تیسرا رخ یہ ہے کہ تخلیقی مسرت کی حامل انوکھی مسافتوں میں حیرت تواتر و تسلسل قائم رہا ہے۔''(۱۵)

اس مجموعہ کے انشائیوں میں لکھنے والے کی تخلیقی ظرف کا عمدہ اظہار ہوا ہے۔انشائیہ کے لیے جس نفاست، سنجیدگی اور مزاج کی اعلیٰ کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان انشائیوں میں موجود ہے۔ یہ سارا عمل جتنا پیچیدہ ہے اتنا ہی مشکل بھی، اس لیے اچھا انشائیہ نگار سست رفتار ہوتا ہے۔'دوسرا کنارہ' میں صرف سترہ انشائیے شامل ہیں جو سولہ سال کے عرصہ میں لکھے گئے خود آغا صاحب کہتے ہیں:

> ''یہ میرے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔اس میں کل سترہ انشائیے شامل ہیں جو پچھلے سولہ برس میں لکھے گئے ہیں۔ گویا سال میں ایک انشائیہ۔یہی شاید انشائیہ کی رفتار بھی ہے۔ رفتار جو گھڑی کی ٹک ٹک سے مشابہ نہیں بلکہ فطرت کی اس رفتار کی مانند ہے جو پھول کے اور اوس گرنے میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔''(۱۶)

اشیاء کو ایک مختلف نظر سے دیکھنا اور اس مشاہدے کے نتیجے میں ایک غیر معمولی معنویت سے آشنا ہونا، ایک ایسی مسرت ہے جو'دوسرا کنارہ' کے انشائیوں میں پوری طرح موجود ہے۔

'سمندر اگر میرے اندر گرے' وزیرآغا کے انشائیوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ کے نظریے کے برعکس سمندر کو اپنے اندر سمونے کا عمل ہے۔اس مجموعے کے انشائیوں میں وزیرآغا کی فلسفیانہ سوچ ایک غیر معمولی آفرینی سے ہمکنار ہو کر سرشاری کی ایسی کیفیت پیدا کرتی ہے جو قاری کو اس ازلی مسرت سے آشنا کراتی ہے جو زندگی کا حاصل ہے۔ان انشائیوں کا فکری تناظر بہت وسیع ہے اسلوب کی ندرت اور شگفتگی کی مٹھاس قاری کو عمر بھر کے لیے ایک ایسی دنیا میں لے جاری ہے جہاں روح تھوڑی دیر کے لیے جسم سے باہر نکل کر کائنات کی وسعتوں کا مشاہدہ کرتی اور ان وسعتوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔منور عثمانی کے خیال میں:

''سمندر اگر میرے اندر گرے'' کے انشائیوں میں بطور خاص وہ قوت اور امنگ موجود ہے جو ہماری خارج کے داخلی نشاۃ الثانیہ کو وقوع پذیر کر سکتی ہے۔''(۱۷)

ان چاروں مجموعوں کو سفر کے چار پڑاؤ سمجھا جائے تو ڈاکٹر وزیر آغا کے ذہنی سفر کی مختلف کیفیات سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ وہ ایک سیاح کی طرح اپنے سفر پر نکلتے ہیں اور گیانی بن کر لوٹتے ہیں۔ سیاح کی حیثیت سے ان کا سفر اردگرد کی اشیاء کی لطف اندوزی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ان پر، ان کی ماہیت پر غور کرتے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور سفر کی لذتوں اور صعوبتوں سے گزرتے، کبھی چلچلاتی دھوپ میں پیاس کی شدت اور کبھی گہرے پانیوں میں لمس کی لذت، کبھی چھاؤں کی تمنا میں سوکھتے قدم اور کبھی برگد یا بیل کی گھنی چھاؤں کا سوندھا پن، خوابوں میں تیرتے پرندے جو مسافر سے مکالمہ کرتے ہیں۔ رنگی برنگی تتلیاں جو ہاتھوں میں ریشمی رنگ چھوڑ دیتی ہیں۔ سفر کا یہ لمحہ آہستہ آہستہ گیان کی دشوار راہوں میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے، چیزوں سے لطف اندوزی گہری فکر میں بدل جاتی ہے۔ اب وہ اشیاء کے ظاہری پن سے گزر کر ان کے بطون میں اترنے اور انہیں سمجھنے کی منزل سے گزرتے ہیں۔ صوفی مفکر کے اس مقام پر اشیاء کی ظاہرداری ختم ہو جاتی ہے۔ اب سوال اشیاء کی قلب ماہیت کا آجاتا ہے۔ اشیاء بکھرتی ہیں تو نئی صورتوں میں جنم لیتی ہیں۔ کائنات ایک تسلسل ہے۔ دم بدم بدلتی صورتوں کا تسلسل اکائی کیا ہے، اجتماع کیا ہے، تضاد کیا ہے اور اس سارے تماشے میں انسان کیا ہے۔ ان سارے سوالوں کا جواب انہیں ایک ایسے مقام پر لے آتا ہے جہاں سے ہر شے اپنی اصل کے ساتھ موجود ہے، یہی گیان کا لمحہ ہے اور یہی وہ عظمت ہے جو وزیر آغا کو گیانی کا روپ دیتی ہے اور ان کے اظہار میں معنوی گہرائیوں اور؟ ؟ کے دروازے کھولتی چلی جاتی ہے۔

وزیر آغا کے موضوعات کی گہرائی اسی گیان کی دین ہے اور وزیر آغا کے انشائیوں میں موجود ہے۔ وہ زمین اور معاشرے سے متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ بہت وسیع افق بھی رکھتے ہیں۔ دراصل آغا صاحب اب اس مقام پر ہیں جہاں ان کی سوچ میں گہرا فلسفیانہ رنگ ابھر آیا ہے۔ اور وہ عام سطح سے بلند ہو کر صوفی کے درجے پر جا پہنچے ہیں۔ لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ ان کا تصوف آج کے بہت سے خود ساختہ صوفیوں کی طرح نہ تو کراماتی ہے اور نہ پیری مریدی کے کس سلسلے کا وسیلہ بلکہ وہ اسے غور و فکر کی ایک کیفیت کے طور پر محسوس کرتے ہیں اور اپنے احساس کو دوسروں تک فکری سطح پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ اس سطح پر ہے جہاں اشیاء پرت در پرت اپنے معنی وا کرتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہمہ جہتی ایک نہ ختم ہونے والا تماشا ہے۔ جس کے سو رنگ ہیں اور کوئی رنگ نہیں ایک بات شروع ہوتی ہے تو سو باتیں نکلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ محض آغا صاحب کے صاحب مطالعہ ہونے ہی کی دلیل نہیں بلکہ اس بات کا اظہار ہے کہ وہ کتنی گہری نظر سے اشیاء کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کا موضوع انسان، کائنات اور متعلقات انسان ہے لیکن وہ نہ تو انسان کے صرف خارجی روپ کو دیکھتے ہیں اور نہ اس کی داخلیت تک محدود ہوتے ہیں بلکہ اس کے خارجی

سے ہوتے ہوئے بطون میں اور بطون سے خارج میں آتے ہیں۔ اس سفر میں انسانی سائیکی کے سارے روپ سامنے آجاتے ہیں۔ اور زمان ومکان کے ساتے فلسفے حل ہونے لگتے ہیں۔ وقت اور مکان دو ایسے معاملے ہیں جن کی گتھیاں سلجھاتے فلسفہ کے ہاتھ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں وقت ایک اہم کردار ہے۔ وہ حال کے نقطہ پر کھڑے ہو کر ایک طرف تو ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف مستقبل کے دھندلکے کو بھی محسوس کرتے ہیں لیکن اس سارے عمل میں ان کی ذات گم نہیں ہوتی۔ وہ کشف کے اس سفر سے اگلے ہی لمحہ حال میں لوٹ آتے ہیں۔ ان کی یہ غواصی نہ تو پرانے صوفی کی داخلیت ہے اور نہ سائنس کی خالصتاً خارجیت کہ وہ انسان کو بنیادی حقیقت تصور کرتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کو انسانی سائیکی کے تین دروازے سمجھتے ہیں۔ انکشاف ذات کا یہ لمحہ بہت لذت بھرا ہے اور وقت کے ہاتھوں پٹی پٹائی، پامال اور پیش پا افتادہ اور اشیاء اور موسموں کو نئے رنگ اور نئی رتیں عطا کرتا ہے۔ یہ تازگی، یہ مسرت اور اجنبیت کا تجسس ہی ان کے انشائیہ کی روح ہے اور وزیر آغا روح کی اس مسرت کو نہ صرف سمیٹ لینے کا ظرف رکھتے ہیں بلکہ اسے دلکش اسلوب میں قاری تک پہنچانے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک صاحب اسلوب ادیب ہیں۔ تنقید اور شاعری میں بھی ان کا اپنا ایک انداز ہے، ایک ایسا انداز جس کے اثرات پاک و ہند کے بہت سے لکھنے والوں کے یہاں واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ آغا صاحب تنقید میں اپنے اسلوب کے موجد ہیں ار وانشائیہ میں تو خاص طور پر انہوں نے اس کی اہمیت وضرورت پر زور دیا ہے وہ کہتے ہیں:

> ''انشائیہ اس مضمون کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہیں اشیاء یا مظاہرہ کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر، ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔'' **(۱۸)**

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

> ''انشائیہ ایک تو اسلوب یا انشاء کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرے یعنی زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرے۔'' **(۱۹)**

زبان کو تخلیقی درجہ پر لانا ایک مشکل مرحلہ ہے جس کے لیے نہ صرف ایک بڑی خلاق شخصیت کی ضرورت ہے بلکہ زبان و بیان پر مکمل گرفت بھی ہونا چاہیے کہ اسلوب کے نئے پن کے بغیر تخلیق میں مٹھاس پیدا نہیں ہوتی، اسلوب وہ سند ہے۔ جو کسی تخلیق کو عصری صداقت سے ہمکنار کرتی ہے، انشائیہ میں اسلوب کی دو باتیں خصوصی ہیں۔ اول یہ کہ اشیاء کو لفظوں اور لفظوں سے اشکال میں ڈھالنے کی وہ قدرت جس سے ان کی داخلی اور خارجی تصویریں بنتی

چلی جاتی ہی ۔ دوسرے وہ اعلیٰ درجے کی روانی جو سلاست و بلاغت کے ساتھ ایک ادبی معراج اور جس بھی رکھتی ہے۔آغا صاحب استعاروں اور علامات کی تخلیق کی بے پناہ قدرت رکھتے ہیں اور یہ چیز انہیں صاحب اسلوب ادیب بناتی ہے۔تنقیداورانشائیہ میں ان کے اسلوب کا پھیلاؤ بہت سے لکھنےوالوں کواپنے اندرسمیٹتامحسوس ہوتا ہے۔

وزیرآغا کے اسلوب میں ان کا خام مواد بھی بنیادی چیز ہے یہ خام موادانھوں نے دیہاتی زندگی اوراس عظیم ثقافتی ورثہ سے حاصل کیا ہے جوکئی صدیوں کا سفر طے کرکے ان تک پہنچا ہے۔دیہات میں رہنے والے شخص کا ویژن شہری زندگی سے بہت وسیع ہوتا ہے کہ دیہات میں آدمی تخلیق کے عمل کو اپنی کھلی آنکھ سے دیکھ اور محسوس کرسکتا ہے۔ وہ کلیوں کے چٹکنے کی آواز سنتا ہے خوشبوؤں کو پھیلتے دیکھتا ہے۔ پھیلے ہوئے کھیتوں میں اپنے ذات ایک مرکزی نقطہ کی طرح لگتی ہے جس میں ساری کائنات سمٹ آتی ہے۔وہ ایک ایسی خوشی سے ہمکنار ہوتا ہے جوشہر کی مصنوعی فضا میں ممکن ہی نہیں۔لیکن اگر بات یہیں تک محدود ہوتی تو یقیناً ایک رخ ہی ٹھہرتا۔وزیرآغا نے شہری زندگی کوبھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ٹریفک کے اژدھام میں دم گھٹتے لوگ،ملوں کی چمنیوں سے نکلتا کثیف دھواں اور بڑی عمارتوں کے نیچے دھوپ سے محروم سڑکیں، یہ سارے تماشے بھی ان کی نظر میں ہیں۔ چنانچہ ان کے اسلوب میں ایک ایسی کاٹ ہے جو اپنی انتہائی ملائمت کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی نزاکتوں کوفنی اور تخلیقی مراحل سے گزار کرایک نہ مٹنے والا نقش بناتی چلی جاتی ہے ۔ان کے اسلوب میں علامت کا بنیادی ڈھانچہ دیہاتی پس منظر کے مطالعہ پر استوار ہے۔ پیڑ، پرندے،آسمان،کھیت اس کینوس کے مرکزی رنگ ہیں۔ جوایک منظر بھی بناتے ہیں۔اور ایک تہذیب کے خطوط بھی نمایاں کرتے ہیں۔اسلوب کی خلاقانہ حیثیت تہذیبی بھی ہے،عصری بھی اور تخلیقی بھی۔

وزیرآغا ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔جس کے کئی روپ ہیں۔اور یہ سارے روپ شانتی،مٹھاس اور ٹھہراؤ کے ہیں۔طبیعت کی یہ نفاست اور زیرکی ان کے انشائیوں کی بنیادی پہچان ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا انشائیہ کے لیے علم،فکر،فلسفہ اور نفاست کا ایک جگہ جمع ہونا ضروری ہے۔وزیرآغا کی شخصیت میں یہ سارے پہلو موجود ہیں۔اور جب وہ ان سارے پہلوؤں کے ساتھ کشف کے لمحہ سے گزرتے ہیں تو شانت کا وہ مقام آتا ہے جہاں برگد کے نیچے بیٹھے ان کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ ابھرتی ہے۔جس میں کائنات کے سارے راز،سارے رنگ چھپے ہوئے ہیں۔ یہ مسکراہٹ جب لفظوں کا روپ دھار کر انشائیہ کی شکل اختیار کرتی ہے تو وزیرآغا کی انشائیہ ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں پوری کائنات اور انسان اپنی سائیکی کے ساتھ منعکس ہوتا ہے اور پڑھنے والے کوگیان کے اس مقام پر لاکھڑا کرتا ہے جہاں کھڑے ہوکر غالب نے کہا تھا کہ:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، انشائیہ کیا ہے، مشمولہ: انشائیہ کے خدوخال، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۰ء، ص ۹
۲۔ وزیر آغا، کچھ اُردو انشائیہ لے بارے میں، ص ۱۷
۳۔ رشید امجد، کچھ انشائیہ کے بارے میں، مشمولہ: روپے اور شناختیں، لاہور: مقبول اکیڈمی ۱۹۸۸ء، ص ۳۳
۴۔ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، انشائیہ کے خدوخال، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۰ء، ص ۴۷
۵۔ ایضاً
۶۔ منور عثمان، دیباچہ، پگڈنڈی، لاہور: اظہار سنز ۲۰۱۰ء، ص ۷
۷۔ انور سدید، دیباچہ، انشائیہ اُردو ادب میں، لاہور: فکر و خیال،
۸۔ رشید امجد، انشائیہ اُردو ادب میں، مشمولہ: روپے اور شناختیں، لاہور: مقبول اکیڈمی ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۵
۹۔ انور سدید، دیباچہ، ایضاً
۱۰۔ انور سدید، انشائیہ اُردو ادب میں، ص ۱۱۲
۱۱۔ ایضاً، ص ۷۵
۱۲۔ ایضاً، ص ۹۳
۱۳۔ ایضاً، ص ۸۳
۱۴۔ وزیر آغا، دیباچہ دوسرا کنارہ
۱۵۔ منور عثمانی، دیباچہ، پگڈنڈی، ص ۲۱
۱۶۔ وزیر آغا، دیباچہ، دوسرا کنارہ
۱۷۔ منور عثمانی، دیباچہ، پگڈنڈی، ص ۲۲
۱۸۔ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۰ء
۱۹۔ ایضاً

❀❀❀